اداریہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ وطنِ عزیز میں عام انتخابات منعقد ہو گئے، ہارنے اور جیتنے والے سب ہی اہلِ سیاست نے نتائج تسلیم کر لیے اور انتقالِ اقتدار کا "سخت" مرحلہ بخیر و خوبی طے پا گیا۔ اس جمہوری عمل میں جہاں مسلم اکثریت نے حصّہ لیا، وہیں غیر مسلم اقلیتوں نے اپنے اپنے انداز اور عددی قوت کے مطابق دلچسپی لی۔ عام انتخابات کا اعلان ہوتے ہی مسیحی برادری کے بعض حلقوں کی جانب سے بائیکاٹ کی آواز بلند ہوئی مگر قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے مسیحی اُمیدواروں کی تعداد، اُن کی پُر جوش انتخابی مہم اور اُن کے حق میں ڈالے گئے ووٹوں کی تعداد نے دو اور دو چار کی طرح یہ حقیقت واضح کر دی کہ انتخابات کا بائیکاٹ کرنے والے بزرگ اپنی برادری کی سوچ سے ہم آہنگ نہ تھے۔

مسیحی برادری کی جانب سے قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے اُمیدواروں کی غالب اکثریت نے مسیحی سیاسی جماعتوں کے پلیٹ فارم سے اپنی مہم چلائی یا اپنی ذاتی آزادانہ حیثیت سے ووٹروں سے رابطہ قائم کیا۔ گزشتہ قومی اسمبلی میں حزبِ اختلاف کے بنچوں پر بیٹھنے والے جناب جے - سالک نے پاکستان پیپلز پارٹی کے قریب ہونے کے باوجود آزادانہ حیثیت سے انتخاب میں حصّہ لینے کو ترجیح دی، تاہم گنے چُنے مسیحی اُمیدوارانِ اسمبلی نے اپنی حکمتِ عملی کے تحت بڑی سیاسی جماعتوں، جن کی باگ ڈور مسلم سیاست دانوں کے ہاتھ میں ہے اور جو اسلام کے حوالے سے یکساں طور پر قومی اُمنگوں کی نمائندگی کرتی ہیں، کی حمایت حاصل کی اور اپنے آپ کو اِن جماعتوں کے "حمایت یافتہ" اُمیدواروں کے طور پر متعارف کرایا۔ انتخابات کے نتائج سے واضح ہوا ہے کہ مسیحی برادری نے اُن اُمیدواروں کو اپنی نمائندگی کے لیے زیادہ پسند نہیں کیا۔ سابق وزیرِ مملکت برائے اقلیتی اُمور جناب پیٹر جان سہوترا پاکستان مسلم لیگ (نواز شریف گروپ) کی تائید اور حمایت کے باوجود ہار گئے، اسی طرح جناب فرانسس جوزف کے لیے پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کی شریک چیئرپرسن محترمہ بے نظیر بھٹو کے بیانات چنداں مفید ثابت نہیں ہوئے۔ وہ اُمیدوار کامیاب ہوئے جنھوں نے اپنی برادری کی حمایت اور تائید ہی کو سب کچھ خیال کیا۔

انتخابی مہم کے دوران میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ مسیحی اُمیدواروں نے "حقوق کی جنگ" کو بڑی اہمیت دی اور جس اُمیدوار نے یہ کارڈ زیادہ اور بہتر طور پر استعمال کیا، وہ انتخابات میں بہتر کارکردگی دکھانے میں کامیاب رہا۔ جناب جے - سالک نے قومی اسمبلی کے چار ارکان میں سے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کیے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے ذاتی تعارف میں لکھ رکھا تھا کہ "جے - سالک جس نے

بارہ سال سے حقوق کی جنگ لڑی، جس نے دو دفعہ کونسلر ہو کر، دو مرتبہ ممبر قومی اسمبلی کی سیٹ پر جانے کی بجائے جیلوں میں جانا پسند کیا اور طرح طرح کی اذیتیں جھیل رہا ہے۔ لوگ اُسے پاگل، ڈرامہ کہتے ہیں۔ لیکن یہ پاگل، قوم کو حقوق دلانا چاہتا ہے۔"

انتخابی مہم کے دوران میں نگران وزیر اعظم نے ایک سے زائد بار اس طرف توجہ دلائی کہ پاکستان میں اقلیتوں کو دستوری اور قانونی حقوق حاصل ہیں۔ اور اُن کی بہتری کے لیے مزید اقدامات کیے جائیں گے۔ اس کے بعد اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے کمیشن کی تشکیل بھی ہو گئی، تاہم بُرا ہو احتجاجی سیاست کا کہ اسپیکر اور ڈپٹی اسپیکر کے انتخاب کے لیے قومی اسمبلی کے اجلاس میں ناخوشگوار اور تلخ صورت حال پیدا ہوئی۔ پہلے تو جناب طارق - سی - قیصر نے نقطۂ اعتراض پر کہا کہ "ہمارا حق مارا گیا ہے۔ اگر ہم سے پہلے دن حلف لے لیا جاتا تو ہم بھی اسپیکر کے انتخاب میں اپنا اُمیدوار پیش کرتے، ہمارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔" صدرِ اجلاس نے وضاحت کرتے ہوئے جناب قیصر کو بتایا کہ وہ حلف اٹھانے کے بعد ہی نقطۂ اعتراض پر بات کر سکتے ہیں۔ اس پر جناب قیصر نے کہا کہ "آپ ہمیں اٹھا کر باہر پھینکوا دیں" تو جناب صدرِ اجلاس نے کہا کہ وہ کسی کو ایوان سے باہر نہیں نکال سکتے۔ اُنہیں بڑی خوشی ہوتی، اگر اُن کی جگہ کوئی ہندو یا عیسائی اسپیکر بیٹھا ہوتا۔

جب اقلیتی ارکانِ اسمبلی کی جانب سے حلف برداری کا وقت آیا تو فادر روفن جولیس نے حلف کی عبارت پر اعتراض کیا جس میں قیامِ پاکستان کی بنیاد، اسلامی نظریے کے تحفظ کے لیے جدوجہد کی بات کی گئی ہے تاہم اُنہوں نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد حلف اٹھا لیا۔ فادر روفن جولیس پہلی بار نومبر ۱۹۸۸ء میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ اُس وقت اُنہوں نے یقیناً یہی حلفِ رکنیت اٹھایا تھا اور جب وزیرِ مملکت برائے اقلیتی اُمور نامزد کیے گئے تھے تو ایک بار پھر اُنہوں نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے بنیادی نظریے کے تحفظ کی قسم کھائی تھی۔ یہ سب کچھ ریکارڈ پر ہونے کے باوجود اس بار اُن کا طرزِ عمل "تلخ نوائی" پر مبنی کیوں رہا؟ کیا یہ طرزِ عمل اُن کے لیے مقبولیت کا باعث ہو گا اور آئندہ جب کبھی وہ انتخابی میدان میں اُتریں گے، اس "کارنامے" کی بدولت وہ کچھ مزید ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب رہیں گے؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو اقلیتی رکنِ اسمبلی، مسیحی برادری کو احتجاج اور ٹکراؤ کی راہ پر ڈال رہے ہیں، مگر یہ روّیہ وطنِ عزیز کے مفاد میں نہیں قرار دیا جا سکتا۔ بجا طور پر ایوان کی اس نشست میں یہ واضح کر دیا گیا کہ "دُنیا بھر میں یہ ہوتا ہے کہ جو ملک جس نظریے کی بنیاد پر بنا ہے، اُس کی حفاظت کا حلف دیا جاتا ہے، اس میں اقلیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اور یہ آئین کا حصّہ ہے، اگر کوئی شخص ایسی بات کرتا ہے تو وہ آئین اور قانون کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔"

یہ اسی "حقوق کی جنگ" اور احتجاجی سیاست کا انداز ہے کہ مسیحی برادری کے کچھ رہنما بعض خالصتاً

قانونی اور آئینی مسائل کے حوالے سے مغربی دُنیا میں وطنِ عزیز کو بدنام کرنے کے لیے کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ پچھلے دنوں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس نسیم حسن شاہ ایک مسیحی تقریب میں مہمان تھے۔ اُن کے سامنے وطنِ عزیز میں مسیحی برادری کے ساتھ امتیازی سلوک کی جو تصویر پیش کی گئی، اِس میں مبالغہ کی آمیزش تھی۔ جناب چیف جسٹس نے اِس امر پر حیرت کا اظہار کیا کہ مسیحی طلبہ کو بارہویں جماعت تک "اسلامیات" پڑھائی جاتی ہے۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ ممکن ہے کہ اِکا دُکا تعلیمی اداروں میں یہی صورتِ حال ہو، بالخصوص اُن اداروں میں جہاں مسیحی طلبہ و طالبات کی تعداد بہت کم ہو اور اُن کے لیے مسیحی اساتذہ کی فراہمی ناممکن ہو اور خود والدین بوجوہ اپنے بچوں کو "اسلامیات" کا متبادل نصاب "اخلاقیات" نہ پڑھا سکتے ہوں۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ مسیحی طلبہ و طالبات خود "اخلاقیات" کی جگہ "اسلامیات" پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ سینٹ انتھونی ہائی اسکول (لاہور) ایک مسیحی تعلیمی ادارہ ہے۔ اِس معروف ادارے کے سربراہ سے جب پوچھا گیا کہ "اسلامیات کے متبادل آپ اِس اسکول میں مسیحی بچوں کو کیا پڑھاتے ہیں؟" تو اُنھوں نے بتایا کہ

> بچے خود تقریباً اسلامیات پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ اِس کے مقابلے میں اخلاقیات ذرا مشکل ہے۔ شروع شروع میں بچوں نے ایسا کیا لیکن بعد میں خود ہی اُنھوں نے اسلامیات پڑھنے کو ترجیح دی۔ (پندرہ روزہ "کاتھولک نقیب" لاہور - یکم یا ۱۵ مارچ ۱۹۹۲ء)

اِس کے ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون طلبہ و طالبات ہیں جنھوں نے اسکولوں اور کالجوں میں "اسلامیات" پڑھ کر مسیحیت سے توبہ کرلی ہے اور وہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے ہیں؟ جو مسیحی طلبہ و طالبات "اسلامیات" پڑھتے ہیں، وہ "اخلاقیات" کی نسبت اِس میں زیادہ نمبر حاصل کرتے ہیں اور مقابلے کی دوڑ میں بہتر پوزیشن میں رہتے ہیں۔ اِس کے ساتھ ہی وہ مسلم عقائد، عبادات اور رسوم سے بہتر طور پر واقف ہو جاتے ہیں۔

جناب چیف جسٹس نے مسیحی برادری کو درپیش مبیّنہ مسائل غور سے سنے اور تقریب کے منتظمین کو بتایا کہ اعلیٰ عدالتوں نے مسیحیوں کے لیے بہت سے فیصلے کیے ہیں، نیز درپیش مسائل کے لیے اُنھیں اعلیٰ عدالتوں سے رجوع کرنا چاہیے جو عدل و انصاف اور دستور و قانون کے تحت ہر فرد اور گروہ کے مفادات کے تحفّظ کی ذمہ دار ہیں۔ ایک مسیحی تقریب میں ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کے چیف جسٹس کا موجود ہونا اور اُن کا ٹھنڈے دل سے جذباتی انداز میں بیان کیے گئے مسائل کو سننا، اِس امر کا غمّاز ہے کہ پاکستان کی مسلم اکثریت جہاں اپنے نظریّے کا تحفّظ چاہتی ہے، وہیں وہ اپنے غیر مسلم بھائیوں کے مسائل سے ہمدردی رکھتی ہے۔

مزید براں ملک کے اعلیٰ ترین اداروں میں مسیحی برادری کو نمائندگی حاصل ہے۔ ان میں وہ اپنی شکایات پیش کر سکتی ہے جو افہام و تفہیم اور رواداری کے جذبے کے ساتھ دور ہو سکتی ہیں۔ مسیحی رہنماؤں کو چاہیے کہ وہ مسلم اکثریت کے عقائد و نظریات اور وطنِ عزیز کی اساس کے بارے میں کوئی ایسا مطالبہ نہ کریں جس کے تسلیم کیے جانے کی صورت میں اکثریت کو شکایات پیدا ہوں۔ اسی طرح اکثریت کے روادارانہ طرزِ عمل سے یہ توقع کی جانی چاہیے کہ مسیحی برادری کے واقعی مسائل ترجیحی بنیادوں پر حل کیے جائیں گے۔

جناب برنارڈ لویس کا مقالہ

زیرِ نظر شمارہ میں جناب برنارڈ لویس کے مقالہ "انگلستان اور عربی علوم و فنون" کی تیسری اور آخری قسط شائع کی جا رہی ہے۔ جناب برنارڈ لویس نے ۱۹۴۰ء میں جن زندہ مشاہیر کا ذکر کیا تھا، آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ نکلسن، گِب، اسٹوری اور ان کے معاصر مستشرقین کے جانشین بھی جامعات اور علمی اداروں میں نئی نسل کے لیے جگہ خالی کر چکے ہیں۔ استشراق کی تحریک کئی مراحل طے کر چکی ہے۔ تعصّب کے بادل کچھ کم ہو گئے ہیں مگر مفادات کا ٹکراؤ حسبِ دستور باقی ہے۔ اب بھی تحریکِ استشراق محض علم و ادب کی پیاس بجھانے کے لیے نہیں بلکہ مغربی قوموں کے سیاسی و معاشی مفادات کے گرد گھوم رہی ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ پرچوں میں ہم اپنے قارئین کے لیے تحریکِ استشراق پر مزید لوازمہ پیش کریں گے۔